SHNAKHAT E(ISSN) 2709-7641, P(ISSN) 2709-7633
Vol:3, ISSUE:2 (2024) PAGE NO: 227-235
Publishers: Nobel Institute for New Generation
http://shnakhat.com/index.php/shnakhat/index

Cite us here: ثقلین احمد خاں (ثقلین سرفراز), علی مرتضیٰ, & ارشد محمود ہادیؔ. (2024). Colonial Trends in Premchand's Fiction: پریم چند کے افسانوں میں نوآبادیاتی رجحانات. Shnakhat, 3(2), 227-235. Retrieved from https://shnakhat.com/index.php/shnakhat/article/view/296

" Colonial Trends in Premchand's Fiction
"پریم چند کے افسانوں میں نوآبادیاتی رجحانات

1 ثقلین احمد خاں (ثقلین سرفراز) | 2 علی مرتضیٰ | 3 ارشد محمود ہادیؔ

لیکچرار شعبہ اردو، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
لیکچرر، شعبۂ اردو زبان وادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

Abstract

Prem Chand is a fictional writer with a keen mind of Urdu literature. Some realism is seen in his writings, and some romantic style of thought is prominent. Overall, he has a strong awareness of contemporary issues. Apart from all these. If seen from a deeper point of view, in some of his fiction, we also see the spread of colonial elements. The word colonialism is the plural form of colonialism. When a state takes over a weaker and less important state by force or force, makes its people subordinate to them, and forces them to work for their own interests, then this process is called colonialism. There are a lot of colonial elements in chess players. Two characters in it show that they are so busy in the game that they don't care about the situation of the country because of this, the colonizer will be able to maintain their dominance easily. For this reason, the people there, being intoxicated in luxury and ignorant of the conditions of the country, were inviting the colonial class to come and occupy us. In addition to this, Premchand's legend is my homeland. If we look at the context, it also feels like giving us a sense of the stateless, and this perspective of rousing the spirit of patriotism is undoubtedly born from the womb of colonial awareness

Keywords: Colonialism, Realism, Romanticism, Behaviorism, Dictatorship, Absurdism

فکشن کا بادشاہ افسانوی ادب کی سب سے مستحکم اور مستند روایت کے حامل افسانہ نگار اور ناول نگار پریم چند جن کا اصل نام دھنپت رائے تھا لیکن ادبی دنیا میں منشی پریم چند کے نام سے شہرت حاصل کی۔ اردو کا افسانوی ادب جتنا پریم چند سے متاثر ہوا اتنا کسی دوسرے مصنف سے نہیں ہوا۔ پریم چند نے جہاں انسانی نفسیات کا مطالعہ طبقاتی جبر کے حوالے سے کیا وہیں انہوں نے داستانوں کا اثر لیکر عشق و محبت کی فرضی داستانوں اور طلسمی قصہ کہانیوں کو بھی اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ ان کی تحریروں میں کہیں حقیقت پسندی اور کہیں

رومانوی انداز فکر نمایاں جھلکتا ہے۔ اس کے علاوہ معاشرے کے طبقوں اور کسانوں کے حقوق کے لئے اپنی آواز اور قلم دونوں کو بلند کیا۔ ان سب کے علاوہ اگر عمیق نظری سے دیکھا جائے تو ان کے بعض افسانوں میں ہمیں نوآبادیاتی عناصر کا پرچار بھی نظر آتا ہے۔

نوآبادیات کا لفظ ''نوآبادی'' کی جمع ہے۔ مختلف لغات میں اس کے معنی نئی آبادی یا نئی بستی کے ہیں۔ انگریزی زبان وادب میں اسے کالونی کہتے ہیں۔ اگر بنیادی طور پر دیکھا جائے تو لفظ ''کالونی'' Colnia سے نکلا ہے۔ جب کوئی ریاست اپنے بازو قوت پر یا افواج کے بل بوتے پر خود سے کمزور اور غیر اہم ریاست پر زبردستی قبضہ کر کے وہاں کے باشندوں کو اپنا ماتحت بنا کر مجبوراً اپنے مفاد کی خاطر کام کروائے تو اس عمل کو ''نوآبادیات'' کہتے ہیں۔ بنیادی طور پر قابض ریاست کا مقبوضہ ریاست کے قدرتی وسائل، تجارتی منڈیوں اور افرادی قوت پر ہوتا ہے۔ جس کی مدد سے وہ اپنی معاشی اور اقتصادی ترقی کو یقینی بنانے کے لئے بھرپور اور کامیاب کوشش کرتی ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر ''نوآبادیاتی'' کی وضاحت یوں پیش کرتے ہیں:

''یہ انسانوں کے مخصوص گروہ کے ہاتھوں مخصوص مقاصد کی خاطر برپا ہونے والی صورت حال ہے۔''(۱)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ چند افراد کا باقاعدہ طور پر دوسری انسانی آبادیوں پر قبضہ کر لینا اور اپنے خاص مقاصد کی خاطر ان سے کام کروانا، ایسی صورت حال بنانے والے گروہ کو ''نوآباد کار'' کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنے آبائی علاقوں سے اپنا تعلق بالکل ہی نہیں توڑتے بلکہ ان کے ساتھ مکمل طور پر اپنا رابطہ بحال رکھتے ہیں۔ متقابض ریاست اپنی تہذیب و ثقافت، سماجی روایات اور معاشرتی طور طریقوں کو چھوڑتی نہیں بلکہ اپنے اُن سماجی روایات واقدار کو اس نئی جگہ کو عوام میں رائج کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بتدریج وہاں کے باشندوں کے دل ودماغ پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ آنے والا نئے لوگ پرانے علاقے میں بسنے والے لوگوں کے نہ صرف ظاہری خدوخال پر بلکہ ان کے دل ودماغ پر بھی اپنی حکمرانی کے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ دراصل غالب ریاست مغلوب ریاست سے معاشرتی، معاشی اور سائنسی میدان میں زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ اس لئے وہ خود کو مغلوب ریاست کے باشندوں کی نسبت بالاتر اور مقدم سمجھتی ہے۔

اسی سلسلے میں ڈاکٹر مبارک:

(i)''ہم بہتر قوم ہیں لہذا خدا کی مدد ہمارے ساتھ ہے۔''

(ii)''ہم مہذب اور ترقی یافتہ ہیں۔ اس غلام قوم کی اصلاح ہمارا فرض ہے۔''(۲)

جب ایک نسل خود کو بہتر اور دوسروں سے افضل تصور کرتی ہے تو یہ ترقی اور تمکنت اسے دوسرے اقوام عالم کو زیر نگین کرنے اور ان کے وسائل کو استعمال کر کے مزید ترقی یافتہ ہونے کی خواہش کو ہوا دیتی ہے۔ پس یہ ظاہر ہوا کہ یہ استعماری قوتیں تہذیب یافتہ اور فوقیت حاصل ہونے کی بنا پر اپنے زیر تسلط قوم کا مال غین کرنے، جائیدادوں پر حکمرانی اور ان کی زمینوں پر قابض ہونا نہ صرف بہتر تصور کرتی ہیں بلکہ اپنا حق سمجھتی ہیں۔ کیونکہ قابض اقوام یہ سمجھتی ہیں کہ وہ اللہ کے حکم سے انہی کی تبلیغ کرتی ہیں۔ اس لئے جو بھی ان کے نظریے کے متضاد چلتا ہے۔ ان کے مال و دولت پر قبضہ کر کے انہیں صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیں گے۔ لہذا ان تمام حالات کی روشنی میں یہ طے ہوا کہ غالب ریاست ہمیشہ مغلوب ریاست کے باشندوں پر اپنی مرضی کے مطابق قاعدے اور قانون مقرر کر کے اپنی حکومت کا تسلط برقرار رکھتی ہے۔

شطرنج کے کھلاڑی میں اودھ کے دو عام شہریوں کو کرداروں کی صورت میں پیش کر کے باہم کھیل کود میں مصروف دکھایا گیا ہے۔ وہ دونوں کردار شطرنج کھیلنے کے رسیا ہیں۔ شطرنج محض ذہنی داؤ پیچ لڑانے کا کھیل ہے اور عین اسی طرزِ عمل سے مشابہت رکھتا ہے۔ جس کا اظہار ہم نوآبادیاتی صورتِ حال میں دیکھتے رہتے ہیں۔ ایک نوآباد کار بھی شطرنج کی بساط کی طرح اپنے زیر تسلط علاقے میں غور وخوض کرتا اور وہاں کے مقامی افراد کو مہروں کی طرح آگے پیچھے کر کے اپنی جگہ مضبوط کرتا ہے۔ مرزا سجاد علی اور میر روشن علی ملک کی سیاسی صورتِ حال سے بے بہرہ اپنی بساط بسائے سارا سارا دن کھیل میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ حالات سے بے فکری اور کھیل کود کا ماحول بھی خاص نوآباد کاروں کا پیدا کردہ ہے کہ انہوں نے اہلِ لکھنو کو کھیل کھیلنے کا موقع دے رکھا تھا۔ ان دو کرداروں کی طرح ملک کی مجموعی بساط میں مقامی بادشاہ اور نوآباد کار بھی باہمی بساط پر سیاسی شطرنج کھیل رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ یہاں کا ماحول باہر کے لوگوں کے لیے بہت سازگار تھا اور ماحول انحطاط کی آخری حد تک پہنچ چکا تھا۔ جب زندگی میں حقیقت ہی نہ رہے تو لوگوں کو وقت کا احساس بالکل ہی نہیں ہوتا اور اس طرح وہ فارغ کھیلوں میں وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ اس طرح اگر عمیق نظر سے دیکھا جائے تو پوری سوسائٹی اوپر سے نیچے تک انحطاط کا شکار ہو چکی تھی۔ نوآباد کاروں کے لیے یہاں کی زمین بہت ہموار ہو چکی تھی۔ اگر غور کیا جائے تو نوآباد کار آئے نہیں بلکہ ان کو بلایا گیا ہے کیونکہ حکمران سے لے کر آخر تک طبقہ عیش وعشرت میں ڈوب چکا تھا اور ان پر باآسانی غلبہ پایا جا سکتا تھا۔

افسانے میں ایک جگہ پریم چند لکھتے ہیں:

''ایک دن دونوں احباب بیٹھے بازی کھیل رہے تھے۔ میر صاحب کی بازی کچھ کمزور تھی۔ مرزا صاحب انہیں کشت پر کشت دے رہے تھے کہ دفعتاً کمپنی کی فوج سڑک پر سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ کمپنی نے لکھنؤ پر تصرف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ قرض کی علت میں سلطنت ہضم کر لینا چاہتی تھی۔ وہی مہاجنی چال چلی جس سے آج ساری کمزور قومیں پابہ زنجیر ہو رہی تھی۔'' (۳)

اس پیرا گراف میں پریم چند حاکم اقوام کی ترقی پذیر اور غریب ممالک پر قبضہ کرنے کی مالی چال چلتے دکھایا گیا ہے۔ پس پشت یہ وہی طریقے ہے جس سے آج بھی پاکستان جیسے غریب ممالک جکڑے ہوئے ہیں اور پریم چند کے اس افسانے میں عصری معنویت کے چراغ بھی روشن نظر آتے ہیں۔

مصنف اپنے افسانے میں تحریر کرتے ہیں کہ

''اب کے دونوں دوست کھیلنے بیٹھے تو تین بج گئے۔ اب کے مرزا جی کی بازی کمزور تھی۔ اسی اثنا میں فوج کی واپسی کی آہٹ ملی۔ نواب واجد علی شاہ معزول کر دیے گئے تھے۔ اور فوج انہیں گرفتار کیے لیے جاتی تھی۔ شہر میں کوئی ہنگامہ نہ ہوا نہ کشت خون، یہاں تک کہ کسی جانباز نے ایک قطرہ خون بھی نہ بہایا۔
نواب گھر سے اس طرح رخصت ہوئے جیسے لڑکی روتی پیٹتی سسرال جاتی ہے۔'' (۴)

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اپنی عیش و عشرت میں اس قدر مست تھے کہ انہیں ملک کے حالات سے کوئی غرض نہ تھی۔ وقت کے بادشاہ نواب واجد علی شاہ کو گرفتار کر کے جا رہے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو کی ایک بوند تک نہ آئی بلکہ وہ تو اپنے کھیل میں اس قدر محو ہیں کہ جیسے انہیں خبر تک بھی نہ ہو۔ اس سے ظاہر ہوا کہ یہ ماحول نوآبادکاروں کا پہلے ہی سے طلبگار تھا تاکہ وہ آئیں اور ان پر حکمرانی کریں۔

معاشرے کی ذرا انحطاط پذیر صورتِ حال تو دیکھیے کہ وقت کے بادشاہ کی خاطر دونوں کی آنکھوں سے ایک بوند آنسو کی بھی نہ آئی۔ نوآبادکار ایک طرف تو ان کے حکمران کو پکڑ کر لے جاتے ہیں اور پھر دوسری طرف ان کی چال تو ذرا دیکھیں کہ پھر عوام کو آپس میں لڑا کر جان سے مار دیتے ہیں اور اس طرح معاشرے میں مزید اپنے پنجے جمانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ غرض یہ کہ نوآبادکار نے اپنے ہتھکنڈے پورے طریقے سے استعمال کیے اور پھر ان میں کامیاب بھی ہوئے۔ اس حد تک کھیل میں مگن ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو جان سے مار دیتے ہیں اور شطرنج کے وزیروں کی خاطر اپنی گردنیں تک کٹا دیتے ہیں۔

پریم چند ان کی عکاسی کچھ یوں کرتے ہیں:

''اندھیرا ہو گیا تھا۔ بازی بچھی ہوئی تھی۔ دونوں بادشاہ اپنے اپنے تخت پر رونق افروز تھے۔ ان پر حسرت چھائی ہوئی تھی۔
گویا مقتولین کی موت کا ماتم کر رہے ہیں۔ چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ کھنڈر کی پوشیدہ دیواریں اور خستہ حال کنگرے اور سربسجود مینار ان لاشوں کو دیکھتے تھے اور انسانی زندگی کی بے ثباتی پر افسوس کرتے تھے۔'' (۵)

اس طرح پورا افسانہ نوآبادیاتی دور میں مقامی لوگوں کی کم نظری اور سیاسی صورتِ حال سے بے نیازی برتتے دکھائی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ نوآبادکاروں کو ہندوستانی کماشتوں کے ذریعے آہستہ آہستہ ہندوستان پر اپنی بازی کھیلتے دکھائی دیتے ہیں۔

پنڈت اماوت شکل جو کہ بالکل ہی نکما اور نالائق لڑکا ہے۔ ایک ادنی سے گھرانے سے جس کا تعلق ہے۔ جس کی معاشرے میں کوئی وقعت نہیں اور نہ ہی کوئی جان پہچان ہے۔

ہماری معاشرتی طبقے کی تقسیم اس قسم کے لڑکے کو بالکل ہی اچھوت سمجھتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود نوآبادیاتی نظام نے اس ادنی سے لڑکے کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا صرف اور صرف اپنے مفاد کی خاطر کیونکہ وہ مقامی تھا اور مقامی باشندوں کی ضروریات اور سوچ پر پورا اترتا تھا اور نوآبادیاتی طبقے کی طرف سے ایک اچھا نمائندہ بن کر منظر عام پر آیا۔ جونہی معاشرے میں کچھ مقام حاصل ہوا تو ہر وقت وہ سیاست کی باتیں کرتا نظر آتا اور اسی طرح سیاسی لوگوں کے ساتھ بھی کافی جان پہچان ہو گئی اور جان پہچان کے بعد ان کے ساتھ بھی کافی وقت گزارتا تھا تاکہ مزید ان لوگوں سے اس کے اچھے تعلقات استوار ہو سکیں۔

پریم چند جن کی عکاسی کچھ یوں کرتے ہیں:

"جب دیکھیے کسی رائے صاحب یا سیٹھ صاحب کی نشست گاہ میں لیٹے ہوئے برقی پنکھے کی ہوا کھا رہے ہیں۔ اور پولیٹیکل گپیں لڑ رہی ہیں۔ اگر رائے صاحب نے پوچھا۔ "کیوں شکل جی! ستیا گرہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"، تو شکل جی نے ذرا مسکرا کر جواب دیا۔ اجی ستیا گرہ میں کیا رکھا ہے، مگر ہاں ایک بات ضرور ہے کہ اس وقت اس کی کچھ کچھ ضرورت ہے۔"(۶)

افسانہ لیڈری کا پیشہ میں پنڈت امادت شکل نے اس طرح بہت ہی نام کمایا اور اس میں طرح طرح کے گن بھی تھے۔ وہ بات کو ماحول کی مناسبت سے کرنے کا بہت بڑا فن رکھتا تھا۔ عوام کے لگاؤ کو مدِ نظر رکھنا اس کی اوّلین ترجیح ہوتی تھی۔ پنڈت امادت شکل عوام کی عکاسی اس طرح کرتا کہ ان کا دل جیت لیتا تھا۔

اس ضمن میں پریم چند لکھتے ہیں کہ:

"جب دیکھتے تھے کہ پبلک کا رجحان اس وقت فلاں بڑے رہنما کو گالیاں دینے کی طرف زیادہ ہے تو آپ گالیوں کی ایسی پھلجھڑیاں چھوڑتے کہ سننے والے مارے خوشی کے پھول اُٹھتے اور جب دیکھتے کہ پبلک اس وقت ان کی تعریف سننے سے خوش ہوتی ہے تو تعریفوں کے پل باندھ دیتے تھے۔"(۷)

پنڈت امادت شکل کو مزید عوام میں نام کمانے کی خاطر طرح طرح کی سہولیات میسر کی جاتی ہیں تاکہ جتنا وہ عوام میں مقبول ہوگا ان کے دلوں اتنا اچھا تاثر قائم کرے گا تو اتنا ہی پس پردہ نوآبادیاتی نظام اس کے ذریعے اپنا مفاد نکالے گا۔ ایک شخص جو کہ اتنی عزت کا بالکل اہل ہی نہیں ہے۔ اس کو اپنی اوقات سے بھی زیادہ عزت دینے کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ وہ صرف اور صرف یہ کہ اس کو مزید اپنے شکنجے میں جکڑ کر اپنے مفاد کی خاطر استعمال کیا جائے۔

پنڈت امادت شکل ان کاموں میں دن بدن اتنا محو ہوتا گیا کہ اس کو اپنے گھر کی بھی خبر تک نہ رہتی وہ کئی کئی دن گھر بھی نہ آتا جو کہ ہمارے سماج کے بالکل ہی منفی بات ہے۔ اس کو گھر سے اتنا دور اور بے خبر کر دیا جاتا ہے کہ اس کے والد کی وفات ہو جاتی ہے اور وہ والد کا منہ تک دیکھنے نہیں آتا کیونکہ وہ اتنا زیادہ مصروف ہوتا ہے اور احساسِ ذمہ داری کا منہ بولتا ثبوت دیتا ہے کہ وہ اپنے فرائض کو پوری دلجمعی سے نبھا رہا ہے۔

پریم چند اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"لیگ کے کام کی انجام دہی کے لیے شکل جی تین ماہ سے باہر پھر رہے تھے۔ انہی دنوں میں تار ملا کہ ان کے والد صاحب سورگ سدھار ہو گئے۔ شکل جی نے بڑے افسوس کا اظہار کیا اور تار کے ذریعے یہ جواب بھیجا۔ بڑا دکھ ہوا مگر آ نہیں سکتا۔ کام کے مارے ذرا بھی فرصت نہیں۔"(۸)

کیا ہماری کامیابی کا راز اسی میں ہے کہ ہم والدین کی عزت کرنا چھوڑ دیں ان کی خدمت کرنا چھوڑ دیں اور عوام کی خدمت میں اپنی پوری زندگی وقف کر دیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جو شخص اپنے گھر کو نہیں سنبھال سکتا وہ اوروں کا کیا خاک بیڑا پار کرائے گا۔

یہ صرف اور صرف اس کے ذہن کی کم عقلی تھی جو کہ اسے مسلسل اس کام میں مصروف رکھ رہی تھی اور وہ بھی بد قسمتی سے اسے اپنی عزت سمجھتا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے ذہن کی کم عقلی کے علاوہ یہ نوآبادیات کی پرورش کا منہ بولتا ثبوت بھی تھا اور اسی ضمن میں وہ بھی بڑا اہم کردار ادا کر رہی تھی کہ لوگوں کے دل و دماغ پر حاوی ہو رہی تھی اور ان کو اپنے والدین سے دور کر کے اپنے مفاد کی خاطر بھرپور استعمال کر رہی تھی۔ حتیٰ کہ ایسی پرورش کا ان کو احساس تک نہ ہوتا تھا کہ وہ غلط کر رہے ہیں یا ٹھیک۔ یہ سارا نظام نوآبادکاروں کا ماتحت تھا اور انہی کے پروپیگنڈے کے مطابق چل رہا تھا۔ نوآبادکار اپنی سوچ ان کے دل و دماغ پر حاوی کر چکے تھے اور وہ اسی سوچ کے مطابق چلنا ہی کامیابی سمجھتے تھے۔ وہ تو یوں سمجھتا تھا کہ پورا ملک اور پوری قوم کی اصلاح کا بیڑا اس نے اپنے کندھوں پر اُٹھا رکھا ہے۔ یہ صرف اور صرف نوآبادیاتی نظام کا اس کے روح و قلب پر حاوی ہو جانے کا نتیجہ تھا۔ افسانہ یہی میرا وطن ہے ہیں ایک بوڑھا شخص جو اپنے وطن سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے لیکن اس کے باوجود پھر بھی وہ روزی کمانے کی خاطر ہجرت کر کے امریکہ چلا جاتا ہے۔ امریکہ جانا اس کی اپنی مرضی ہے وہ زبردستی اپنے ملک سے ہرگز نہیں نکالا جاتا بلکہ یہ تو اس کے بہت بڑے خواب ہوتے ہیں جو اس کو اپنے ملک سے جدا کرنے ہیں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ورنہ دنیا کی کوئی طاقت بھی اس کو اپنے وطن سے جدا کرنے کی ہمت نہیں رکھتی اور نہ ہی کسی کا ظلم اسے اپنے وطن کو چھوڑنے پر مجبور کر سکتا ہے۔

پریم چند بوڑھے کے الفاظ یوں قلم بند کرتے ہیں:

> ''مجھے پیارے ہندوستان سے کسی ظالم کے جور و جبر یا انصاف کے زبردست ہاتھوں نے نہیں جدا کیا۔ ظالم کا ظلم اور قانون کی سختیاں مجھ سے جو چاہیں کرا سکتی ہیں مگر میرا وطن مجھ سے نہیں چھڑا سکتیں۔ یہ میرے بلند ارادے اور بڑے بڑے منصوبے تھے جنھوں نے مجھے دیس سے جلاوطن کیا۔''(۹)

ساٹھ برس کے بعد جب یہ بوڑھا شخص واپس وطن آتا ہے تو اسے یہاں پر پہلے جیسا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا بلکہ سب کچھ بدلا ہوا نظر آتا ہے تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا یہ میرا ہی دیس ہے اور پھر خود ہی کہتا ہے کہ نہیں یہ میرا دیس ہر گز نہیں کیونکہ مجھے تو یہاں اپنے دیس جیسا کچھ بھی نہیں لگ رہا۔ بوڑھا شخص جب بمبئی جہاز سے اترا تو لوگوں کے لباس کو دیکھ کر بھی حیران ہو گیا نہ صرف لباس کو بلکہ وہ لوگ اب انگریزی بھی بولنے لگے۔ اس کے بعد تھوڑا میں آگے چلا تو میری آنکھیں کیا دیکھتی ہیں کہ یہاں پر انگریزی طرز کی عکاسی کرتی ہوئی دکانیں بھی نظر آ رہی ہیں۔

اسی ضمن میں مصنف کچھ یوں اظہار خیال کرتا ہے:

> ''مگر جس وقت بمبئی میں جہاز سے اترا اور کالے کالے کوٹ پتلون پہنے اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتے ملاح دیکھے۔ پھر انگریزی دکانیں، ٹراموے اور موٹر کار گاڑیاں نظر آئیں۔''(۱۰)

یہ سب کچھ نوآبادکاروں کی دین تھی اور لوگوں نے نوآبادکاروں کی تہذیب و ثقافت کو یوں اپنایا جیسے ایک ماں اپنے بچھڑے ہوئے اکلوتے بیٹے کو گلے لگاتی ہے۔ یہ مقامی باشندوں کا بھولا پن تھا کہ وہ نوآبادیاتی طرز کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

چند قدم آگے چل کر دیکھتا ہے کہ یہ وہ نالا ہے جہاں پر ہم اکثر و بیشتر گھوڑے نہلانے کے لیے آیا کرتے تھے مگر اب تو اس کے دونوں طرف کانٹوں دار خاروں کی چار دیواری ہے۔ اس کے سامنے ایک بنگلہ تھا جہاں پر کچھ انگریز بندوقیں لیے بیٹھے تھے۔ یہ تو سب کچھ ہی بدل چکا ہے۔ میرے پیارے دیس پر انگریز لوگ حکومت کر رہے ہیں۔ انھی کا دور دورہ شروع ہو گیا ہے۔ ہر طرف انھی کی بنائی ہوئی نئی چیزیں نظر آ رہی ہیں۔ جب کہ میرے پیارے دیس میں تو یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔

پریم چند اپنے افسانے میں لکھتے ہیں:

> ''یہ وہ نالا ہے جس میں ہم روز گھوڑے نہلاتے اور غوطے لگاتے تھے۔ مگر اب اس کے دونوں طرف کانٹے دار تاروں کی چار دیواری کھنچی ہوئی تھی اور سامنے ایک بنگلہ تھا جس میں دو تین انگریز بندوقیں لیے اِدھر اُدھر تاک رہے تھے۔''(۱۱)

یہ ساری تبدیلیاں دیکھ کر میں تو حیران رہ گیا اور یہاں پر لوگ بھی پہلے جیسے نظر نہ آتے تھے۔ آگے چل کر دیکھتا ہوں تو میرے ہاتھوں کا بنا ایک اکھاڑہ ہوتا تھا۔ اب وہاں سکول بن گیا تھا۔ برگد کا ایک پیڑ ہوتا تھا جہاں میں نے اپنی جوانی کی بہاریں اڑائی تھی اب وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ تھانہ بن چکا ہے۔ یعنی نوآبادیاتی نظام کو رائج کرنے والے باشندوں نے ہماری یادداشت کو بھلانے کے لیے ہمارے دیس کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی نئی نئی چیزیں متعارف کرواتے رہے جس سے ہمارے دیس کے بھولے بھالے لوگ بھی بہت خوش نظر آتے تھے۔

پریم چند اس منظر کو اپنے الفاظ میں یوں قلم بند کرتے ہیں:

> ''صدہا آدمی چلتے پھرتے نظر آئے جو عدالت اور کلکٹری اور تھانہ پولیس کی باتیں کر رہے تھے۔ ان کے چہروں سے تفکر اور پژمردگی نمایاں تھی اور وہ سب افکار دنیا سے خستہ حال معلوم ہوتے تھے۔ میرے ساتھیوں کے سے قوی ہیکل، خوش رو، سرخ و سفید نوجوان کہیں نہ دکھائی دیے، وہ اکھاڑہ جس کی میرے ہاتھوں نے بنیاد ڈالی تھی، وہاں اب در و دیوار شکستہ اسکول تھا اور اس میں چند مریض صورت، گرسنہ رو اور دلق پوش لڑکے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔''(۱۲)

یہ سب کچھ نوآبادیاتی نظام کا منہ بولتا ثبوت تھا جو کہ انھوں نے یہاں آکر بالکل ہی اپنا نظام رائج کیا جس میں وہ کامیاب ہوئے اور اس طرح لوگوں کے دل و دماغ پر مسلط کر دیے گئے۔ وہ بے چارہ اسی سالہ بوڑھا اپنے وطن کی محبت سے واپس آیا تو اسے کچھ بھی یہاں اپنے وطن جیسا نہ ملا۔ وہ جہاں بھی جاتا مایوسی اس کا مقدر بن چکی تھی۔ نوآبادیاتی

باشندے یہ سب کچھ مقامی باشندوں کے مفادات کے لیے نہیں بلکہ اپنے پاؤں جمانے کے لیے سب کچھ کر رہے تھے تاکہ ہم لوگوں کے دل و جان میں سما سکیں اور اس طرح اگر ہم مقامی باشندوں کے دلوں میں گھر کر جائیں تو یہاں رہنا بہت ہی آسان ہوگا۔

آخر کار بوڑھے کے دل میں خیال آیا کہ میرے پردیس جاتے وقت ایک دھرم شالہ بنا تھا۔ میں وہ تو دیکھوں۔ جب وہاں پہنچتا ہے تو اس کی نظر دنگ رہ جاتی ہے کہ وہاں تو شراب پینے والوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ یہ حرکت ہمارے روایتی نظام سے بالکل ہی مختلف قسم کی اور گھناؤنی حرکت تھی۔ یہ سارے کا سارا چکر نوآبادیاتی نظام ہے۔ انہوں نے صرف اور صرف اپنے آپ کو یہاں کے لوگوں پر مسلط کر رکھا تھا اور ان کی عیش و عشرت کا مکمل طور پر بندوبست کیا ہوا تھا۔ اس طرح وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔

پریم چند کچھ یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

"مجھے اس دھرم شالہ کا خیال آیا جو میرے پردیس جاتے وقت بن رہا تھا۔ میں ادھر کی طرف لپکا کہ رات کسی طرح وہیں کاٹوں مگر افسوس ہائے افسوس! دھرمشالہ کی عمارت جوں کی توں تھی لیکن اس میں غریب مسافروں کے رہنے کے لیے جگہ نہ تھی۔ شراب اور شراب خوری، بدکاری اور قمار بازی نے اسے اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔"(۱۳)

یہ ایک نوآبادیاتی نظام کی بھرپور اور بہت ہی نمایاں جھلک ہے۔ انہوں نے یہاں کے باشندوں کو غلام بنانے کی کوئی کسر نہ چھوڑ رکھی تھی۔ آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور نوآبادیاتی نظام کو مقامی باشندوں پر مسلط کر کے ہی دم لیا۔

افسانہ ووٹر میں بابو راج نرائن اور پنڈت جوالا پرشاد دونوں دوست ہوتے ہیں۔ لیکن دوست ہونے کے باوجود بھی وہ ایک دوسرے کے خلاف الیکشن میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بابو راج نرائن کو خواہ مخواہ الیکشن میں حصہ لینے کا شوق ہوتا ہے کیونکہ اس کی بھی معاشرے میں کافی جان پہچان ہوتی ہے تو وہ بھی سوچتا ہے کہ کیوں نہ اس دفعہ میں خود ہی الیکشن میں کھڑا ہو جاؤں۔ ویسے بھی الیکشن کا سارا دارومدار ووٹوں پر ہوتا ہے۔ اس لیے بابو راج نرائن نے سوچا کہ یہ موقع ہاتھ سے ہرگز نہ جانے دیا جائے۔ اس لیے بابو راج نرائن بھی الیکشن کے لیے بڑے ذوق و شوق اور جذبے سے میدان میں اترے۔

پریم چند بابو راج نرائن کی خواہش کو یوں لفظوں کا روپ دیتے ہیں۔

"اب جب آپ نے یہ سنا کہ کونسل کی ممبری کا دارومدار صرف ووٹوں پر رہ گیا ہے تب آپ نے سوچا، چلو یہ اچھا موقع ہاتھ لگا بلی بھاگوں چھینکا ٹوٹا! لاؤ، ہم بھی بہتی گنگا میں غوطہ لگا ہی لیں۔"(۱۴)

اس افسانے میں سیاسی سرگرمیوں کو اجاگر کرنے کی بہت کامیاب کوشش کی گئی ہے اور یہ سیاست بھی نوآبادیاتی نظام ہی کی دین ہے۔ اسی طرح یہ جو الیکشن کے نظام کو متعارف کرایا گیا ہے۔ یہ نوآبادیاتی نظام کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ہمارے ہاں پرانے زمانوں میں الیکشن کا کوئی تصور ہی نہیں کرتا تھا کیونکہ ہمارے ہاں تو یہ حکمرانی وراثتی طریقے سے چلی آ رہی تھی کہ بادشاہ گیا تو اس کا بیٹا تخت سنبھالے گا۔ لیکن یہاں تو بالکل ہی ترتیب الٹی ہو گئی۔ یہ الیکشن نظام تو نوآبادیاتی نظام کی چال ہے تاکہ یہاں کے مقامی باشندوں کے دل و دماغ کو تبدیل کیا جائے۔ اگر ایسا ہی طریقہ رہا کہ حکمرانی وراثتی طریقے سے چلتی رہی تو نوآبادکار تو یہاں کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ کچھ نہ کرنے کی اصل وجہ حکومت ہوگی کیونکہ جب حکومت ہی ان کے خلاف ہوگی تو وہ معاشرے میں کیسے ترقی کریں گے۔ اس کے علاوہ وہ معاشرے میں کیسے اپنے طور طریقے رائج کریں گے۔

اس لیے جو الیکشن کے نظام کو متعارف کرایا گیا ہے۔ یہ بھی نوآبادیاتی باشندوں کی ایک چال ہے تاکہ وہ بھی معاشرے میں اپنے نہ صرف پاؤں جما سکیں بلکہ ان پر حکومت بھی کر سکیں۔ یہ ان کی چالاکی تھی اور چال تھی جس میں وہ یقیناً کامیاب نظر آتے ہیں۔

مصنف سیاسی نظام کو یوں متعارف کراتے ہیں:

"ایک مرتبہ آپ نے بڑی ہمت سے کام لے کر ایک پولیٹیکل میٹنگ کے صدر بننے کی کوشش کی تھی۔ لوگوں نے آپ کی حوصلہ افزائی کے خیال سے منظور بھی کر لیا۔ اور جلسہ کے اشتہار میں آپ کے صاحب صدر ہونے کی خبر بھی شائع کر دی گئی تھی۔ مگر جس روز جلسہ منعقد ہونے والا تھا، اس سے ایک روز پیشتر مجسٹریٹ نے آپ کو بلا کر ڈانٹا اور میٹنگ میں حصہ لینے سے منع کیا۔"(۱۵)

ہمارے پرانے زمانوں میں مجسٹریٹ کو کوئی جانتا ہی نہیں تھا۔ مجسٹریٹ کا کام مجرموں کو سزا دینا ہوتا تھا۔ یہ بھی ہمارے ہاں نوآبادیات ہی کے توسط سے آیا ہے کیونکہ ہم نے تو مجسٹریٹ کا نام پہلے کبھی سنا بھی نہیں تھا۔ ہمارے ہاں تو معاشرے کے چند بزرگ اور وڈیرے مل کر ہی فیصلہ کر لیتے تھے اور مجرموں کو سزا یا جزا کا حکم سنا دیتے تھے لیکن اب کی بار تو کچھ نیا نظام سماج کو متعارف کرایا جا رہا تھا تو اس میں مجسٹریٹ بنایا گیا جو مجرموں کو سزا یا جزا کے فیصلے سناتا تھا۔

لالہ ہر دت رائے جو کہ بابو راج نرائن کا ملازم ہونے کے باوجود بھی اس کو ووٹ دینے سے انکار کر دیتا ہے اور استعفیٰ بھی دے دیتا ہے۔ یہ ہے شعور آگہی جو کہ نوآبادیاتی نظام نے لوگوں کے اندر پیدا کر دیا۔ ہمارے ہاں تو یہ نظام صدیوں سے چلا آ رہا ہے کہ جس کا کھاؤ اسی کے گیت گاؤ اور پھر ملازموں کی کیا مجال کہ وہ اپنے آقاؤں کی مخالفت کریں بلکہ وہ تو ان کے ہر اچھے برے حکم کو بجالانے کے عادی بن چکے ہوتے ہیں۔

پریم چند لالہ ہر دت رائے کے انکار کو یوں قلم بند کرتے ہیں:

"اس کے بعد قلم اٹھایا مگر کچھ سوچ کر رکھ دیا۔ پھر کچھ سوچتے رہے۔ آخر کار پھر ایک دفعہ ہونٹ دانتوں میں دبا کر قلم اُٹھایا اور اپنے نام کے اوپر ایک لکیر کھینچ دی۔"(۱۶)

جب لالہ ہر دت رائے ووٹ دینے سے صاف اور واضح انکار کرتا ہے تو بابو صاحب بجائے غصہ کرنے کے وہ الیکشن پر اٹھنے کی تیاریاں بھی منسوخ کر دیتا ہے بلکہ استعفیٰ دے دیتا ہے اور اخبار پر خبر بھی چھپ جاتی ہے کہ بابو صاحب اب الیکشن نہیں لڑیں گے۔

پریم چند بابو راج نرائن کے خیالات یوں واضح کرتے ہیں:

"بلاشک میں کھیل کھیل رہا تھا۔ اور یہ میری سخت غلطی تھی۔ میں نے اب کونسل میں جانے کا ارادہ بالکل ترک کر دیا ہے۔ میں اخبارات میں بھی اس امر کی اطلاع شائع کرا رہا ہوں۔"(۱۷)

ووٹ دینا ایک الگ اور نظریاتی بحث ہے لیکن اس کے لیے شعور پیدا کرنے کی سوچ کو بھی نوآبادیاتی نظام کی وجہ سے تقویت ملی۔ یہ کہا کہ جو وراثت سے حکمرانی کرتے چلے آ رہے تھے۔ ان کی آنے والی نسلیں بھی وہیں آکر حکمرانی کے تخت پر عیش و عشرت کریں۔ لوگوں کے شعور کو جگایا گیا کہ ووٹ دینا آپ کے ضمیر کا فیصلہ ہے۔ آپ جس کو چاہیں ووٹ دیں یہاں کوئی وراثتی حکومت نہیں چلے گی۔ بلکہ یہاں ہر ایک کو اپنی محنت کے بل بوتے پر منزل مقصود تک پہنچنا چاہیے۔

لوگوں کے دلوں میں شعور پیدا کرنا، الیکشن کے نظام کو متعارف کرانا یہ سارا نظام نوآبادیات ہی کی دین ہے جو کہ ہماری سمجھ سے بالکل بالاتر تھا۔ اس نوآبادیاتی نظام کو انہوں نے متعارف کروانے کی کامیاب کوشش کی اور اسی نوآبادیاتی نظام کے رائج ہونے سے نوآبادکار ہم پر غالب ہوئے ہیں۔

افسانہ نمک کا داروغہ میں منشی بنسی دھر ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور نہایت ہی فرض شناس اور ایماندار شخص ہے۔ منشی بنسی دھر کو صیغہ نمک کے داروغہ مقرر ہوئے ابھی چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ یورپ کی جانب جوندی بہتی تھی وہاں گاڑیوں کا شور اور آوازیں سنائی دیں۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ یہ گاڑیاں پنڈت الوپی دین کی ہیں جو کہ اپنے علاقے کی بڑی نامور شخصیت ہیں۔ اس علاقے کے رئیس مانے جاتے ہیں اور بڑے بڑے لوگ ان کے پاس رہنے آتے ہیں۔ پنڈت صاحب بہت ہی اثر و رسوخ والے آدمی تھے اور بہت بڑے کاروباری آدمی مانے جاتے تھے۔

مصنف پنڈت کی عکاسی یوں کرتے ہیں:-

"الوپی دین اس علاقے کا سب سے بڑا اور ممتاز زمیندار تھا۔ لاکھوں کی ہنڈیاں چلتی تھیں۔ غلے کا کاروبار الگ، بڑا صاحب اثر، بڑا حکام رس، بڑے بڑے انگریز افسر اس کے علاقے میں شکار کھیلنے آتے اور اس کے مہمان ہوتے۔"(۱۸)

یہاں پنڈت کے تعلقات کی انگریزوں کے ساتھ نمایاں عکاسی کی گئی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پنڈت کے انگریزوں سے بہت مضبوط و مستحکم تعلقات تھے جس کی وجہ سے پنڈت بھی شہر میں بڑے فخر سے رہتے کیونکہ ان دنوں انگریز لوگوں سے تعلقات بنانا باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔ جب پنڈت الوپی دین اور اس کی گاڑیوں کو حراست میں لے لیا جاتا ہے۔ تو پنڈت کو عدالت میں پیش ہونا پڑتا ہے۔ عدالت کے نظام کو بھی نوآبادیاتی باشندوں نے متعارف کرایا کیونکہ یہ عدالت اور وکیل وغیرہ ہمارے ہاں نوآبادیاتی باشندوں کی دین کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انگریزوں نے معاشرے میں بے شمار تبدیلیوں کو منظر عام پر لایا اور اس طرح نوآبادیاتی نظام رائج ہونے لگا۔ ہمارے ہاں تو یہ عدالت اور وکیل وغیرہ بالکل ہی

نہیں ہوتے تھے بلکہ معاشرے کے چند بزرگ لوگ مل کر ہی سارے فیصلوں کا حل ڈھونڈ لیتے تھے۔ جب پنڈت کو عدالت میں پیش کیا گیا تو سب لوگوں کے ہوش اڑ گئے اور پنڈت کے خریدے ہوئے غلاموں کو بھی لوہے کے چنے چبانے پڑ گئے۔ پنڈت کے جاننے والوں اور وکیلوں کے رنگ فق ہو گئے۔

پریم چند اپنے افسانے میں تحریر کرتے ہیں:

> ''مگر عدالت میں پہنچنے کی دیر تھی۔ پنڈت الوپی دین اس قلزم ناپید کنار کے نہنگ تھے۔ حکام ان کے قدر شناس، عملے ان کے نیاز مند، وکیل اور مختار ان کے ناز برادر اور اردلی کے چپراسی اور چوکیدار تو ان کے دام خریدہ غلام تھے۔''(۱۹)

جب صورت حال بہت ہی نازک اور خستہ معلوم ہوئی تو فوراً طرح طرح کی چالیں سوچنا شروع کر دیں تاکہ پنڈت کو عدالت کے اس کٹہرے میں بے نقاب کرنے کی بجائے ان کو عزت سے رہا کیا جائے۔ اب عدالت کے اس کٹہرے میں فرض اور دولت کی جنگ شروع ہوئی۔ لیکن افسوس کہ یہاں بھی فرض کو شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پریم چند اس بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''ایسا شخص جس کے پاس محال کو ممکن کرنے والی دولت اور دیوتاؤں پر جادو ڈالنے والی چرب زبانی ہو کیوں قانون کے شکار بنے حسرت کے بعد ہمدردی کے اظہار ہونے لگے۔ فوراً اس حملے کو روکنے کے لیے وکیلوں کا ایک دستہ تیار کیا گیا اور انصاف کے میدان میں فرض اور دولت کی باقاعدہ جنگ شروع ہوئی۔''(۲۰)

یہاں اگر دیکھا جائے تو نوآبادیاتی باشندے اپنے طریقوں کو رائج کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اس کوشش کو کامیاب بنانے کے لیے وہ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرتے ہیں اور اس طرح وہاں کے رئیس لوگوں سے تعلق بنا کر انہیں اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرتے ہیں۔ آخر کار نوآبادیات اپنے رائج کردہ نئے نظاموں اور اصولوں کے تحت پنڈت کو سچ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اس طرح معاشرے کے رئیسوں کے دل میں اپنا بلند مقام بنانے میں بھی کامیاب ہو جاتا ہے۔ پنڈت الوپی دین کے حق میں مجسٹریٹ نے فیصلہ سنایا۔ یہ مجسٹریٹ بھی نوآبادیاتی باشندوں نے متعارف کرائے۔ انہوں نے ایسی چال چلی کہ صرف فیصلہ ہی نہیں سنایا بلکہ منشی بنسی دھر کو غلطی کو قصوروار بھی ٹھہرایا گیا۔

پریم چند مجسٹریٹ کے الفاظ کو یوں قلم بند کرتے ہیں:

> ''ڈپٹی مجسٹریٹ نے تجویز لکھی۔ پنڈت الوپی دین کے خلاف شہادت نہایت کمزور اور مہمل ہے وہ ایک صاحب ثروت رئیس ہے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ وہ محض چند ہزار کے فائدے کے لیے ایسی کمینہ حرکت کے مرتکب ہو سکتے۔ داروغہ صاحب نمک منشی بنسی دھر پر اگر زیادہ سنگین نہیں تو ایک افسوس ناک غلطی اور خام کارانہ سرگرمی کا الزام ضرور عائد ہوتا ہے۔''(۲۱)

یہ تھی نوآبادیاتی نظام کی حقیقت جس کو ہمارے معاشرے کے بھولے بھالے لوگ اپنانا باعث فخر سمجھتے تھے۔ اس طرح نوآبادیات اپنے مقاصد کو پورا کرنے میں کامیاب ثابت ہوئی اور نوآبادیاتی نظام آسانی سے رائج ہو گیا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ معاشرہ زوال پذیر ہوا۔ اس طرح غریب غریب تر ہوتا چلا گیا اور امیر امیر تر ہوتا چلا گیا۔

حوالہ جات

۱۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، نوآبادیاتی صورتحال، مشمولہ: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان و ادب، مرتبہ: ڈاکٹر ضیاء الحسن، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، لاہور: کلیہ علوم شرقیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور اورینٹل کالج، ۲۰۰۸ء، ص ۶۴۔ ۲۶۳

۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر، برطانوی ہندوستان، لاہور: سانجھ پبلیکیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۔ ۱۱

۳۔ پریم چند، منشی، مجموعہ منشی پریم چند، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۷۷۳

۴۔ ایضاً، ص ۷۷۴

۵۔ ایضاً، ص ۷۷۶

۶۔ ایضاً، ص ۳۵۱

۷۔ ایضاً، ص۳۵۱

۸۔ ایضاً، ص۳۵۲

۹۔ ایضاً، ص۲۳

۱۰۔ ایضاً، ص۲۴

۱۱۔ ایضاً، ص۲۴

۱۲۔ ایضاً، ص۲۴

۱۳۔ ایضاً، ص۲۵

۱۴۔ ایضاً، ص۲۲۳

۱۵۔ ایضاً، ص۲۲۳

۱۶۔ ایضاً، ص۲۲۹

۱۷۔ ایضاً، ص۲۳۰

۱۸۔ ایضاً، ص۱۲۴

۱۹۔ ایضاً، ص۱۲۶

۲۰۔ ایضاً، ص۱۲۶

۲۱۔ ایضاً، ص۱۲۶